زبان: نوآبادیاتی سیاق اور لسانی استعماریت

ڈاکٹر ناصر عباس نیر☆

Abstract

Colonialism has been reasonably described as a long term cultural project. With a view to modify according to the colonial needs, it endeavors to study all facets and features of the culture of the colonized. Being a major component of a culture, language is studied in the colonial context. Colonial context could not encompass the 'value system' of a language that had been developed in a long centuries old cultural process. In the eyes of the colonizer, language is just a data which can be categorized, used and exploited as per desires of the moment. This article aspires to examine the ways and strategies adopted by the colonizers regarding studying language and implementing language policies in the colonized countries.

نوآبادیات، طویل المیعاد ثقافتی منصوبہ تھا۔ سادہ لفظوں میں یہ نوآبادیوں کی ثقافت کو یورپی اصولوں سے جاننے اور پھر اس جان کاری کو ''نوآبادیاتی علم'' میں تبدیل کرنے سے عبارت تھا، اور ''نوآبادیاتی علم''، علم کی وہ خصوصی شاخ ہے جس میں نتائج پر پہلے نظر رکھی جاتی ہے اور یہ نتائج فقط علمی نوعیّت کے نہیں ہوتے، سیاسی، سماجی اور ثقافتی نوعیّت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس علم کے ذریعے ایک واضح اور 'مفید' تبدیلی لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ تبدیلی کی افادیت اور سمت کا تعیّن آبادکار کرتا ہے۔ چناں چہ سادہ لفظوں میں یہ وہ علم ہے جسے طاقت کے حصول کا ذریعہ بنایا

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کلیہ شرقیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

جا سکتا یا طاقت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انگریزوں اور فرانسیسیوں کے لیے کسی ایشیائی یا افریقی ثقافت کے علم کا کوئی مفہوم اس وقت تک مرتب نہیں ہوسکتا تھا، جب تک اس علم کے ذریعے اقتدار اور اجارہ حاصل نہ ہو یا علم، اقتدار کا متبادل نہ بن جائے۔ آبادکاروں کے لیے جاننا تسخیر کرنا تھا۔ سترھویں صدی میں یورپی سائنسوں کا یہ عام اصول تھا۔

> ....دنیا حسیات کے ذریعے قابلِ فہم تھی، حسیات فطری دنیا کے تجربے کو محفوظ کر سکتی تھیں۔ اس دنیا کے بارے میں عمومی عقیدہ تھا کہ الوہی تخلیق ہے؛ تجربی طریقے سے قابلِ فہم ہے؛ اور ان سائنسوں کو تشکیل دینے کی اہل ہے جن کے ذریعے فطرت کے ان قوانین کو منکشف کیا جا سکتا ہے جو دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس کو قابو میں رکھتے ہیں۔(۱)

نوآبادیوں کی ثقافتوں سے متعلق بھی یہ تصوّر قائم کیا گیا کہ وہ فطرت کی مانند قوانین رکھتی ہیں۔ ان قوانین کو تجربی طریقے سے منکشف کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بات مشتبہ ہے کہ نوآبادیاتی ثقافتوں میں الوہی عناصر کی موجودگی کو بھی تسلیم کیا گیا اور اگر کبھی تسلیم کیا بھی گیا تو ان کی الوہیت کو ایک ایسی فطری خاصیّت قرار دیا گیا جسے لاعلمی نے تقدس اور اسرار میں ملفوف کر دیا تھا۔ انیسویں صدی کا یہ عام سائنسی عقیدہ تھا کہ قوانین کا انکشاف اس بنیادی قوّت پر دست رس کو ممکن بنا دیتا ہے، جس کے ذریعے فطرت اور ثقافت کو اپنے مقاصد کے تحت ڈھالا جا سکتا ہے۔

کسی ثقافت کی ریڑھ کی ہڈی کیا ہے؟ یہ سوال ہر ثقافتی مطالعے میں دیر سویر سے ظاہر ہوتا اور نوآبادیاتی ثقافتی منصوبے کے بالکل ابتدائی مرحلے میں اس مسئلے کے حل پر ہی ثقافتی منصوبے کی کام یابی و ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ ۱۶۱۵ء میں طامس رَو جہاں گیر کے دربار میں تجارتی مراعات کی درخواست لے کر حاضر ہوا تو اُسے جو سب سے بڑا عملی مسئلہ درپیش ہوا، اس سے متعلق اُس نے کمپنی کو لکھا:

> ایک اور سخت تکلیف جو مجھے سہنی پڑی وہ ترجمان کی کمی تھی، کیوں کہ دلال

وہی کچھ کہیں گے جو انھیں پسند ہوگا، بلکہ وہ بادشاہ کے خطوط میں ترمیم کر دیں گے۔(۲)

یعنی عملی مسئلہ جہاں گیر کے اصل منشا کو جاننا تھا جو دربار کی زبان فارسی میں ظاہر ہوا تھا اور طامس رَو فارسی نہیں جانتا تھا۔ اُس نے فی الفور بھانپ لیا تھا کہ فارسی سے ناواقفیت اس پورے نوآبادیاتی منصوبے کو چوپٹ کر سکتی ہے، جسے ابھی چند تجارتی مراعات کے پردے میں چھپائے رکھنا قرینِ مصلحت سمجھا گیا تھا۔ چوں کہ فارسی کا علم جلد ممکن نہیں تھا، اس لیے اُس نے یونانی، آرمینی اور اطالوی لوگوں کو اپنا ترجمان بنایا جنھیں فارسی آتی تھی۔ جلد ہی کمپنی اور اس کے ملازمین کو احساس ہوگیا کہ ہندستان اور برطانیہ کے درمیان سب سے بڑی ثقافتی رکاوٹ زبان ہے۔ اگر یہ رکاوٹ برقرار رہتی ہے تو ہندستان ان کے لیے اجنبی اور ناقابلِ تسخیر رہے گا۔ ہر چند کمپنی نے کئی مقامی لوگوں کو بچولیا بنایا۔ انھیں اخوند، دلّال، دُوباشی، گماشتہ، پنڈت اور وکیل کے خطابات دے کر ہندستانی ثقافت کی تھاہ پانے کی کوشش کی مگر یہ سراسر عارضی انتظام تھا۔ کمپنی کے ملازمین مقامی لوگوں سے ہمیشہ شاکی رہے۔ گل کرسٹ نے انگریزی ہندستانی لغت کی تیاری میں فیض آباد کے کتنے ہی ''فاضل ہندستانیوں'' کی خدمات مستعار لیں مگر گلہ مند رہا کہ ہندستانی پنڈت، منشی اپنے آقاؤں کی عام لوگوں سے راست ابلاغ کی کوششوں کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔(۳) ان کے شاکی ہونے کے بعض دوسرے پہلو بھی تھے۔ ایک یہ کہ صرف بچولیوں اور ترجمانوں پر انحصار کا مطلب ہندستانی ثقافت اور زبان کے فقط قلیل حصے تک رسائی تھا جو نوآبادیاتی ثقافتی منصوبے کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ ہندستانی ثقافت کے ان بنیادی قوانین تک رسائی چاہتے تھے جو اس ثقافت کی تہ میں موجود اور اس کارکردگی کو ممکن بنا رہے تھے۔ اس کے لیے اس ثقافت کا براہِ راست تجربی علم حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ سارا علم ہندستانی زبانوں میں بند تھا: کلاسیکی اور ورنیکلر زبانوں میں۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں، خصوصاً بنگال پر قبضے کے بعد برطانوی آبادکار اس نتیجے پر

پہنچ چکے تھے کہ ہندستانی زبانیں، ہندستان کی ثقافت میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ بہ یک وقت زبان کا ثقافتی تصوّر اور ثقافت کا لسانی تصوّر تھا۔ زبان کا ثقافتی تصور، زبان کو محض ابلاغ کا ذریعہ نہیں سمجھتا اور نہ ہی زبان کو فقط روزمرہ کے عملی معاملات میں ایک دوسرے کو شریک کرنے کا وسیلہ خیال کرتا ہے۔ ثقافتی تصور کی رُو سے زبان ایک با قاعدہ علامتی نظام ہے، جس میں کسی سماج کی پوری رُوح اور اس رُوح کے اسرار مضمر ہیں۔ زبان کا علامتی نظام ہی اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ آخر ایک سماج خاص طرح سے کیوں سوچتا؛ خاص انداز میں کیوں دنیا اور کائنات کا ادراک کرتا اور خاص طریقے سے کیوں واقعات پر ردِّعمل ظاہر کرتا ہے؟ یہ کم وبیش وہی تصوّر تھا جسے اٹھارویں صدی میں گیرٹ نے واضح کیا تھا:

> جب کسی شخص کو معلوم پڑتا ہے کہ الوہی مخلوق کی وہ بڑی تعداد، جس کے حضور نسلِ انسانی صدیوں تک کانپتی اور سجدہ ریز رہی ہے، ہیرو غلیفی تحریروں سے اُبھری ہے تو وہ علامتوں کی قوت سے سہم جاتا ہے۔(۴)

اس سوال کا جواب آسان نہیں کہ برطانوی منتظمین زبان کے اس تصوّر تک کیوں کر پہنچے؟ آیا ہندستان میں انھیں ہر قدم پر درپیش ہونے والی ثقافتی رکاوٹوں کے شدید تجربات اور ان پر قابو پانے کی کوششوں نے زبان کا مذکورہ تصوّر قائم کرنے پر مجبور کیا یا اس عہد کا یہ عمومی یورپی لسانی تصوّر تھا؟ ایک بات واضح ہے کہ سترھویں صدی میں زبان کا یہ تصوّر عام فہم نہیں تھا۔ زبان کے ثقافتی تصوّر تک پہنچنے کی غالباً اصل وجہ سترھویں صدی کے وہ عام یورپی سائنسی اصول تھے، جن کا ذکر آ چکا ہے۔ بہ ہر کیف زبان کے ثقافتی تصور یا زبان کو علامتی نظام تصور کرنے کا مطلب اس بنیادی قوّت تک رسائی تھا جس کے آگے ایک سماج کے افراد خود کو ''بے بس'' پاتے ہیں یعنی خود کو اور دنیا کو اسی قوّت کے ماتحت محسوس کرتے ہیں۔ لسانی اور لسانی ثقافتی علامتیں وہ چاک ہیں جن پہ لوگوں کی شخصیتیں ڈھلتی ہیں۔ چناں چہ زبان کے ثقافتی تصوّر کا نتیجہ زبان کے تمام گفتاری اور تحریری مظاہر کو گرفت میں لینا تھا؛ لمحۂ موجود میں بولی جانے والی زبان اور اس زبان میں ظاہر

ہونے والے تحریری متون کا علم حاصل کرنا تھا۔ گویا اس ثقافت کی معاصر اور دستاویزی صورتوں تک رسائی پانا تھا اور ثقافت کے علم برداروں کی ذہنی و جذباتی کائنات تک پہنچنے کی کوشش کرنا اور ثقافت کو ثقافت کے علم کے ذریعے اپنے دائرہ اختیار میں لانا تھا۔ لہٰذا آبادکاروں نے اگر نوآبادیوں کی کلاسیکی زبانوں پر دست رس حاصل کی اور ورنیکلر زبانیں سیکھیں تو وجہ ظاہر ہے۔

ثقافت کے لسانی تصور میں، ثقافت اسی طرح 'مرکزی نظام' ہے جس طرح زبان۔ چناں چہ ثقافت کو زبان کے منہاج پر سمجھا اور اس کے بنیادی ضابطوں اور رسمیات کو گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔ یہی بات ۱۸۳۴ء میں ساں بیو نے کہی۔ ''سماج کی اصل کے سوال کو براہِ راست زبان کی اصل کے سوال تک محدود کیا جا سکتا ہے۔''(۵)

حقیقت یہ ہے کہ نوآبادیات میں زبان کے ثقافتی تصور کی ایجاد، لسانیات اور ثقافتی بشریات میں ایک عظیم پیش رفت تھی، نہ صرف اس سے زبان کا تصور وسیع ہوا؛ زبان آلۂ ابلاغ سے بڑھ کر ثقافتی کردار کی حامل سمجھی جانے لگی بلکہ زبانوں کے اس تقابلی مطالعے کی سائنسی بنیاد بھی رکھی گئی، جس نے دنیا کو زبانوں کی تاریخ اور ان کے باہمی رشتوں کی تفہیم کا راستہ دکھایا۔ لسانیات میں یہ عظیم پیش رفت محال ہوتی، اگر مغربی دُنیا سنسکرت دریافت نہ کرتی۔ اسی حقیقت کے اعتراف کے طور پر رے منڈ شواب نے سنسکرت کی دریافت کو ''زبانوں کا امریکا'' دریافت ہونے کے مترادف قرار دیا ہے۔(۶) اٹھارویں صدی تک مغربی لسانی مطالعات، بائبل کے نسلی اور مابعد الطبیعیاتی تصوراتِ لسان سے آزادی پانے کے لیے جھوجھ رہے تھے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں برطانوی مستشرقین نوآبادیاتی ضرورت کے تحت ہندستانی کلاسیکی زبانوں کے مطالعے پر مائل ہوئے۔ کولمبس کی طرح مستشرقین کو بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں تھا کہ ان کا سامنا کس عظیم دریافت سے ہونے والا ہے۔ میکس مولر نے برملا اعتراف کیا ہے کہ اُس کے پیش رَو ناکام ہوئے، مگر اچانک ایک خوش گوار حادثہ ہوا، ایک برقی شعلے کی طرح! سنسکرت کی دریافت نے لسانی مطالعات میں ایک روشن باب کا آغاز کیا۔ لسانی مطالعات کو بائبل کے نسلی اور مابعد الطبیعیاتی تعصّبات سے

آزاد کیا۔ میکس مولر نے زبان کی سائنس پر اپنے لیکچر میں واضح کیا کہ بائبل کے اثر سے لسانی مطالعے کا ہر پہلو بگاڑ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے مطابق:

> زبانوں کی تاریخ کو نسلوں کی تاریخ سے گڈمڈ کرنے کے عمل نے ہر شے کو بگاڑ دیا؛ بائبل میں مذکور حقائق کسی بھی طرح اوائل زبانوں کے گروہ کو ضروری قرار نہیں دیتے؛ عہد نامہ عتیق کے (زبانوں کے) شجرے غیر متعلق ہیں۔ یہ جن اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں وہ ہماری اصطلاحوں سے لگا نہیں کھاتے۔(۷)

اس طور سنسکرت کے مطالعے سے لسانیات نے اس پیش قدمی کا آغاز کیا، جس کے بغیر لسانیات، سائنس نہیں بن سکتی تھی۔ لسانیات نے سائنس کا مرتبہ حاصل کر کے سماجی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی مطالعات میں کیا کیا نئی جہتیں پیدا کیں، یہ مطالعے کا الگ موضوع ہے۔

چوں کہ زبان کا ثقافتی تصور نوآبادیاتی سیاق میں وضع ہوا تھا، اس لیے اس تصور میں ثقافت کے اقداری عناصر کی شمولیت کی گنجایش نہیں ہو سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نوآبادیات میں زبان کا ثقافتی تصور بعض حوالوں سے محدود اور کم وبیش میکانکی تھا۔ نوآبادیاتی سیاق میں زبان طبعی مظہر کی ان جزئیات کی طرح ہے، جن کا معروضی، واضح اور قطعی علم حاصل کیا جا سکتا، ان کے زمرے بنائے جا سکتے اور ان میں رشتے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ گریرسن نے اس بات کی وضاحت میں لکھا ہے:

> [ہندوستانی] زبانوں کو ایک یا دوسری ترتیب میں منظم کرنا پڑا۔ اس سے گروہ سازی کی ضرورت پیدا ہوئی اور گروہ سازی نے رشتوں کے حوالے سے نظریات سے کام لینے کو ضروری قرار دیا۔(۸)

ایک طرف زبان کا ثقافتی تصور تشکیل دینا اور دوسری طرف اسے طبعی مظہر کی مانند سمجھنے کی کوشش کرنا ایک عجب علمی کوشش تھی اور تضاد سے عبارت تھی۔ غور کیجیے: زبان اگر ثقافتی اور علامتی

وضع ہے تو لازماً ان اقدار اور رسمیات کی حامل ہے جنھیں زبان اور اس کی متعلقہ ثقافت نے مل جل کر جنم دیا ہے۔ ان اقدار کے اچھے یا برے ہونے اور ان رسمیات کے ناقص و صحیح ہونے کا پیمانہ خود یہ اقدار اور رسمیات ہیں۔ انھیں سمجھنے کی کوشش خود ان کے پیمانوں سے کی جا سکتی ہے، مگر ان پر باہر سے یا کسی دوسرے سائنسی اصول یا ثقافتی اقداری نظام کی رو سے حکم نہیں لگایا جا سکتا مگر یہ حکم لگایا گیا۔ زبان بہ طور ثقافتی تصور کا مطالعہ جب اٹھارویں اور انیسویں صدی کے عام یورپی سائنسی اصولوں کے تحت کیا گیا اور زبان کی اقدار اور رسمیات کو طبعی مظہر کی جزئیات کی صورت گرفت میں لیا گیا تو ان کے برے اور ناقص ہونے کے فیصلے صادر کیے گئے اور ان فیصلوں کی بنیاد کے آبادکارانہ مقاصد اور آبادکاروں کے ثقافتی اقداری پیمانے تھے۔ یہ فیصلے زیادہ تر ہندستان کی ورنیکلر زبانوں سے متعلق تھے۔

زبان کی اقدار اور رسمیات سمندر کی تہ میں پڑے موتی نہیں ہوتے کہ آسانی سے نظر نہ آئیں۔ یہ سمندر کی ان لہروں کی مانند ہیں جو سمندر کی روانی کا نتیجہ اور مظہر ہیں۔ لہٰذا ممکن نہیں کہ سمندر (زبان) کا نظارہ اس کی لہروں (اقدار و رسمیات) کے بغیر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اوّل اوّل یورپیوں نے، جب نوآبادیاتی اغراض غیر علانیہ تھیں، تو انھوں نے ہندستان کی زبانوں کی اقدار کے حسن اور رسمیات کی خوبی کو محسوس کیا اور ان کی تحسین کی۔ ایڈورڈ ٹیری (جو طامس رَو کے ساتھ ہندستان آیا تھا) نے ''ایسٹ انڈیز کا سفر'' (۱۶۵۵ء) میں 'اندوستان' (ہندستانی یعنی اردو) کو رواں زبان کہا اور اسے بہت سی باتوں کو چند لفظوں میں بیان کرنے کی خوبی سے متصف قرار دیا، مگر جب 'ہندستانی' اور دیگر زبانوں کے باقاعدہ یورپی مطالعات شروع ہوئے اور ان مطالعات کو اپنے نظامِ حکم رانی کا حصہ بنایا گیا تو برنارڈ ایس کوہن کے مطابق ایک ''علمیاتی عرصہ'' اور ڈسکورس (شرق شناسی) وجود میں آیا جس کے ذریعے علم کی ہندستانی صورتوں کو یورپی اشیا میں تبدیل کر دیا گیا۔(۹) یعنی ہندستانی زبانوں کو یورپی اصولوں اور نوآبادیاتی مقاصد کے تحت زیر مطالعہ لایا گیا۔ ان کا مطالعہ خالص علمی اور بے غرضانہ نہیں تھا، ایک ڈسکورس تھا جو طاقت اور

اجارے کی حکمت عملی سے لازماً ملوث ہوتا ہے۔ اب ہندستانی زبانوں کے یورپی مطالعات (قواعد، لغات، تحقیق، تراجم، نصابی کتب) دراصل وہ 'یورپی اشیا' تھے جن کی اقدار اور رسمیات کا پیمانہ ہندستانی زبانیں نہیں، یورپی اور استعماری تصورات تھے۔ اس امر کی ایک عام مثال گریرسن کا وہ تبصرہ ہے جو اس نے ایڈورڈیٹری کی مذکورہ بالا رائے پر کیا ہے۔ گریرسن فرماتے ہیں کہ ''ہندستانی کو یہ بلا استحقاق شہرت کئی نسلوں تک حاصل رہی۔'' آگے وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک ابتدائی انگریز جج کا قصہ لکھتے ہیں جس نے ایک شخص کی سزائے موت کا طویل فیصلہ انگریزی میں لکھا۔ فیصلے میں جرم کی شدید نوعیت، مجرم کے والدین کے غم ناک احساسات اور توبہ کے بغیر مجرم کی عاقبت کے خراب ہونے کا تفصیلی ذکر کیا۔ جج نے عدالت کے ترجمان سے کہا کہ وہ قیدی کے لیے فیصلے کا ترجمہ کر دے۔ یہ ترجمہ فقط چھ الفاظ پر مشتمل تھا: ''جاؤ، بدذات، پھانسی کا حکم ہوا۔'' ایک طویل فیصلے کا اتنے کم لفظوں میں اس قدر موثر ترجمہ! جج ہندستانی زبان کے ایجاز پر ششدر ہوا اور تحسین کیے بنا نہ رہ سکا۔ (۱۰) گریرسن کے نزدیک ٹیری اور جج کی تحسین و حیرت بلاجواز اور بلا استحقاق ہے۔ کیوں؟ اس لیے نہیں کہ گریرسن، ایڈورڈیٹری اور انگریز جج کی نسبت ہندستانی زبان کی روانی اور ایجاز کی صلاحیت کو پہچاننے اور پھر فیصلہ دینے کی بہتر مہارت رکھنے کے دعوے دار ہیں کہ اُن کے برعکس گریرسن ہندستانی زبانوں کے باقاعدہ محقق اور لسانیات کے ماہر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ گریرسن کا 'ہندستانی' کی روانی اور ایجاز کو بلا استحقاق قرار دینا اُس موقف اور پوزیشن کا اظہار ہے جو شرق شناسی کے ڈسکورس ہی کا ایک جز ہے اور جس کے تحت نوآبادیاتی ممالک کی زبانوں کو خود ان کی اقدار و رسمیات کے پیمانے سے نہیں یورپی آبادکارانہ مقاصد کے تحت سمجھا جاتا اور ان کے بارے میں آرا قائم کی جاتی ہیں۔ اسی بات کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ گریرسن نے جس 'علمیاتی پوزیشن' سے ہندستانی زبانوں کا جائزہ مرتب کیا، اس کی رو سے زبانوں کی فصاحت و بلاغت کی اقدار کا تصور تک محال تھا۔ زبانیں محض data تھیں؛ قابلِ مشاہدہ حقائق کی حامل تھیں جنھیں جمع کیا جا سکتا اور جن کے زمرے اور شجرے بنائے جا سکتے ہیں اور صرف اسی

صورت میں زبانوں کے علم کو ''نوآبادیاتی علم'' میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ زبانوں کو خود ان کے ثقافتی تناظر میں سمجھنے اور خود ایک زبان کی رسمیات وضوابط کو اس زبان کے لیے حکم بنانے کا آغاز سوشیور کے نظریات سے ہوا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں لسانیات کا علم ابتدائی مرحلے میں تھا۔ چناں چہ یورپی آبادکاروں اور مستشرقین نے ہندستانی یا افریقی زبانوں کے مطالعے کے لیے عموماً یورپی سائنس کے ان عام اصولوں سے کام لیا جو طبعی اور سماجی مظہر میں فرق نہیں کرتے تھے۔ روشن خیالی کی عقلیت پسندی انھی اصولوں سے عبارت تھی، جو آفاقی اور غیر مبدل اصولوں کو دریافت کرتی تھی۔ عقلیت پسندی اور آفاقیت پسندی کے اصول اس حقیقت کے سلسلے میں بالکل کورے تھے کہ زبان سمیت دوسرے سماجی مظاہر کا ایک اپنا نشانیاتی نظام (Semiotic System) ہوتا ہے جو طبعی مظاہر سے یک سر مختلف تو ہوتا ہی ہے دوسری زبانوں سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ گویا ہر زبان کا ''نظامِ معانی'' الگ ہے مگر سترھویں تا انیسویں صدی کے یورپی لسانی مطالعات میں زبانوں کے جداگانہ نظام ہائے معانی کا تصور عام طور پر موجود نہیں تھا۔ اس تصور کی عدم موجودگی نے عجب گل کھلائے۔ انگریزی میں معنی کا تصور یہ تھا کہ معنی لفظ میں مقید ہوتا ہے، مگر معنی ہمیشہ کے لیے ایک لفظ میں مقید نہیں ہوتا۔ معنی کو نہ صرف ایک لفظ سے دوسرے لفظ میں بلکہ کسی فطری مظہر میں بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ سو فی صد ترجمہ ممکن اور ٹھیک مترادفات موجود ہو سکتے ہیں۔ گویا معنی آفاقی ہے؛ اس کی ایک بنیادی اور غیر مبدل ساخت ہے۔ اسے ایک زبان کے ایک سے زیادہ لفظوں اور کسی دوسری زبان کے کسی لفظ میں مقید کیا جا سکتا ہے۔ معنی کے اسی تصور کے تحت ہندستانی زبانوں سے انگریزی میں تراجم کیے گئے اور یہ اطمینان محسوس کیا گیا کہ تراجم اصل متن کا متبادل ہیں۔ گل کرسٹ نے The Anti-Jargonist میں ترجمہ کاری کی وضاحت دراصل مذکورہ تصورِ معنی کے تحت ہی کی ہے۔

میں نے ہر پیراگراف کا احتیاط سے جائزہ لیا، جانچا اور اسے درست کیا،

> یہاں تک کہ ہم [گل کرسٹ اور ہندستانی منشی] نے وہ اصل ترجمہ حاصل کر لینے پر دوطرفہ اطمینان محسوس کیا، جس کی اصل متن سے مطابقت اب ایک نئی آزمایش سے مشروط ہے۔ میں اس ترجمے کو لفظ بہ لفظ انگریزی میں ہندستانی متن کی اصل ترتیب کے ساتھ پھر منتقل کرتا ہوں اور اگر تقسیم بذریعہ ضرب کے ثبوت کی طرح، یہ ترجمہ آزمایش پر پورا اترتا ہے تو میں مطمئن ہوں اور مجھے اسے اصل دستاویز کے کامل حقیقی عکس کے طور پر پیش کرنے میں عذر نہیں۔(۱۱)

گل کرسٹ کے متن کو ترجمے اور ترجمے کو متن میں الٹنے پلٹنے اور اسے ضرب تقسیم کے پرتالی قاعدے کی طرح انجام دینے کے پسِ پشت دراصل یہ عقیدہ کام کر رہا ہے کہ ایک زبان کے دوسری زبان میں ٹھیک اور قطعی مترادفات موجود ہیں اور انھیں محنت سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا ہندستانی زبانوں میں بھی معنی کا یہی تصور کارفرما تھا؟

برنارڈ ایس کوہن نے کہا ہے کہ سترھویں صدی کے یورپی،نشانات اور مطابقتوں کی دنیا میں جب کہ ہندستانی 'واقعی اور مادی' دنیا میں رہتے تھے۔(۱۲) لہٰذا مغل ہندستان میں معنی کا تصور انگریزی سے بالکل مختلف تھا۔ ہندستانی فارسی میں معنی اپنے متعلقہ لفظ یا شے کے علاوہ ناقابلِ انتقال تھا، اس لیے کہ الفاظ اور اشیا سے تصورات اور اقدار کا ایک ایسا سلسلہ منسلک تھا، جسے دربار کے کلچر نے بہ طور خاص پیدا کیا تھا اور جسے لفظ سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔لہٰذا بادشاہ جب کوئی فرمان جاری کرتا یا کسی کو خطاب سے نوازتا تو وہ محض حکم اور تحسین سے بڑھ کر ہوتا۔ نہ ان کا ترجمہ ممکن تھا نہ ان کا کوئی متبادل ومترادف۔

معنی کے آفاقی اور مخصوص لفظ کی قید سے آزاد ہونے کا یورپی تصور ایک زبردست تضاد کا حامل بھی تھا، جس کی طرف ابتداً دھیان نہیں تھا۔ اگر ''یورپی معانی'' کے ٹھیک ٹھیک مترادفات ہندستانی زبانوں میں موجود ہیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ یورپ اور ہندوستان ''مطابقتوں

اورنشانات'' کی ایک ہی دنیا میں رہتے بستے ہیں، مگر استعماری تخیّل کے لیے اس سے زیادہ صدمہ انگیز تصوّر ہو ہی نہیں سکتا۔ استعماری تخیّل فرق و امتیاز، درجہ بندی اور تقسیم وتفریق کی جس فرضی دنیا کو وجود میں لاتا ہے، اس میں ''مطابقت ومترادف'' کی کوئی گنجایش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جلد ہی معانی کے آفاقی تصوّر کو یا تو ترک کر دیا جاتا ہے یا اسے یورپی تہذیب کے اس آفاقی بیانیے میں بدل دیا جاتا ہے، جسے ہر جگہ اور ہر زمانے کے لیے مثالی نمونہ قرار دیا جاتا ہے اور اس کے رواج کی مساعی کی جاتی ہیں۔

یورپیوں نے ہندستانی زبانوں کا مطالعہ اپنی زبان کے نظامِ معنی کے تحت کیا۔ نوآبادیاتی سیاق میں زبان کا سوال اوّل اوّل ایک ثقافتی رکاوٹ کے طور پر سامنے آتا اور بعد ازاں ایک ثقافتی منصوبے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ثقافتی رکاوٹ دور کرنے کی غرض سے محکوم ملکوں کی کلاسکی اور ورنیکلر زبانیں سیکھی جاتی، ان کے قواعد، لغات مرتب کیے جاتے؛ ان پر تحقیق کی جاتی اور ان کی تحصیل وتعلیم کے لیے ادارے وجود میں لائے جاتے ہیں، کیوں کہ جب تک یہ ثقافتی رکاوٹ موجود ہے، محکوموں کے لیے نہ احکامات جاری کیے جا سکتے ہیں، نہ ان سے ٹیکس اکٹھا کیا جا سکتا ہے، نہ اپنے وضع کیے گئے قانون کی حکم رانی قائم کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ ثقافتی رکاوٹ دور کرنے کا یہ طریقہ، جس میں نوآبادیاتی باشندوں سے خود ان کی زبان میں تخاطب ہوتا اور ان باشندوں کے مذہب وآئین سے براہِ راست شناسائی کی کوشش ہوتی ہے، طاقت ہی کے حصول کا واضح منشا لیے ہوتا ہے، مگر نوآبادیات کو فقط طاقت کے حصول سے نہیں، طاقت پر حتی المقدور اجارے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے ایک حربے کے طور پر آبادکار اپنی زبان مسلط کرتا ہے۔ زبان کا یہ تسلط ایک کثیر المقاصد ثقافتی منصوبہ ہوتا ہے۔ چوں کہ آبادکار اسی عرصے میں اپنی زبان کے نفاذ کا فیصلہ کرتا ہے، جب نوآبادیاتی ملکوں کی زبانوں کی تحصیل وتحقیق کی ایک باقاعدہ روایت تشکیل پا رہی ہوتی ہے، اس لیے مقامی زبانوں اور انگریزی وفرانسیسی کے ''حامیوں'' میں تنازع بھی جنم لیتا ہے۔ تاہم یہ تنازع مقصد پر نہیں، مقصد کے حصول کے طریقِ

کار پر ہوتا ہے۔ اس تنازعے میں انگریزی وفرانسیسی کے حامی جیت جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی نوآبادیاتی ممالک ایک بالکل نئی ثقافتی صورتِ حال میں داخل ہوتے ہیں۔

محکوم ملکوں میں انگریزی وفرانسیسی کے نفاذ کے فیصلے کے پیچھے دراصل زبان کی 'کثیر الجہاتی طاقت' میں غیر متزلزل یقین کارفرما ہوتا ہے۔ زبان کی اس طاقت کو یورپ نے سترھویں صدی کے آس پاس اس وقت دریافت کیا تھا، جب یورپی 'ورنیکلر زبانوں' (جیسے انگریزی، فرانسیسی، جرمن وغیرہ) نے کلاسیکی لاطینی کی جگہ لینی شروع کی۔ خصوصاً جب عیسائی مذہبی متون کے یورپی ورنیکلر میں تراجم ہوئے۔ اس کے بعد تو گویا دبستان کھل گیا۔ یورپی ورنیکلر میں 'متن سازی' کا وہ لامحدود عمل شروع ہوا، جس نے ورنیکلر کو نہ صرف کلاسیکی لاطینی سے بڑھ کر سماجی حیثیت دی، بلکہ نشاۃ ثانیہ اور پھر جدیدیت کو بھی ممکن بنایا۔ یورپی جدیدیت کے وجود میں آنے اور فروغ پانے میں ایک اہم کردار یورپی دیسی زبانوں میں ان متون کا (بہ صورت ترجمہ یا طبع زاد) وجود میں آنا تھا جو کلاسیکی متون کے حریف ہی نہیں، ان سے اثر وعمل کے لحاظ سے، بڑھ کر بھی تھے۔ اس طور یورپ نے ایک عظیم ثقافتی تبدیلی میں زبان کی طاقت اور کردار کا تاریخی علم حاصل کیا تھا۔

بہ قول وینائزیگل: ''استعماری تخیل کی مدد ان طریقوں کی ثقافتی یادداشتوں نے کی جن کے ذریعے یورپی ورنیکلر نے اپنی جدید کارانہ صورتیں، یونانی اور لاطینی سے براہِ راست تراجم کی وجہ سے اختیار کیں۔'' (۱۳) دوسرے لفظوں میں جب یورپ کے دل میں استعماری امنگیں جاگیں اور وہ توسیع پسندی کے عالم گیر عزائم لے کر ایشیا و افریقہ پہنچا تو اس کے پاس یہ تاریخی وتجربی علم تھا کہ زبان ثقافتی تبدیلی کا غیر معمولی ملکہ رکھتی ہے۔ ایک زبان دوسری زبان کو بے دخل کر سکتی؛ ایک زبان، دوسری زبان کو شرف و اقتدار سے محروم کر سکتی؛ ایک زبان، کسی دوسری زبان کے سارے ''متنی سرمائے'' کو بڑی حد تک اپنی دست رس میں لا سکتی اور نئی طبقاتی اور ثقافتی شناختوں کو وجود میں لا سکتی ہے۔ اسی علم کو یورپ میں جدیدیت (ماڈرنیٹی) اور جدید کاری (ماڈرنائزیشن) کے

لیے استعمال کیا گیا اور اسی علم کو ایشیا و افریقہ میں یورپی استعماری تخیل نے 'کلچرل پالیٹکس' کے لیے برتا۔ ایشیا و افریقہ کی نو آبادیوں میں جدیدیت اور جدید کاری کی جولہر پیدا ہوئی اور ان کی جو صورتیں سامنے آئیں وہ اسی 'کلچرل پالیٹکس' کا بالواسطہ نتیجہ یا باقاعدہ حصّہ ہیں اور یہی حقیقت یورپی جدیدیت کو نوآبادیاتی ممالک کی جدیدیت سے جدا بھی کرتی ہے۔

'کلچرل پالیٹکس' کی کامیابی اس میں تھی کہ اس کا ایک 'پرسونا' تیار کیا جاتا۔ چناں چہ ۱۸۳۷ء میں جب انگریزی کو ہندستان میں ذریعہ تعلیم اور عدالتی زبان کے طور پر نافذ کیا گیا تو اس کے اصل منشا پر مشنری مقصد کا نقاب چڑھایا گیا۔ اوّل یہ بات ثابت کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی کہ تمام نوآبادیاتی ممالک تہذیب سے عاری ہیں۔تہذیب کو ایک وسیع المعانی اصطلاح کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس میں علم، اخلاق، قانون، امن، ادب ایسے کئی عناصر شامل سمجھے گئے۔ ہر چند نوآبادیاتی ملکوں کے کلچر میں یہ عناصر پہلے سے موجود تھے، مگر انھیں یورپی معیارات سے جانچا گیا اور ان سے مختلف و متصادم سمجھا گیا۔ مختلف و متصادم عناصر کی ثقافتی تعبیروں کا مٹنا پانے کے بجائے یورپی تہذیب کو برتر اور کسوٹی قرار دے دیا گیا۔ نوآبادکار جب یہ ثابت کرنے میں کام یاب ہو گیا کہ ان کی نوآبادیوں میں یورپی طرز کی تہذیب کا گزر نہیں؛ اور یہ کام یابی بڑی حد تک ریاستی اداروں پر اجارے کا نتیجہ تھی تو اسے بہ قول ارل گرے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں تھا کہ ''کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ سفید آدمی کو لازماً اپنی برتر تہذیب کو کالی نسلوں پر مسلط کرنا ہے اور وہ کرے گا۔'' (۱۴) اسی بات کو زیادہ زور دار پیرائے میں رُڈیارڈ کپلنگ نے The White Man's Burden میں پیش کیا۔فروری ۱۸۹۹ء میں Mc Cluver's Magazine میں شایع ہونے والی اس نظم میں نوآبادیاتی باشندوں کو 'نصف شیطان اور نصف بچے' قرار دیا گیا تھا، جنھیں مہذب بنانے کا بارِگراں سفید آدمی نے اپنے نازک شانوں پر لیا۔

Take up the white Man's buden /Send forth the best ye bread - -

Go, bind your sons to exil/ To serve your captive's need;

To wait, in heavy harness, / on fluttered and will - -

Your new-caught sullen peoples./Half devil and half child(15)

'نصف شیطانوں اورنصف بچوں' کومہذب بنانا ثقافتی منصوبہ تھا۔ اس کے لیے انگریزی کو'مہذب بنانے کی قوت' کےطور متعارف کرایا گیا۔ اہلِ یورپ نے زبان کی تہذیب سازی کی قوت کا تصور اسی 'ورنیکلر ائزیشن' سے اخذ کیا تھا، جس کے ذریعے دیسی انگریزی نے کلاسیکی لاطینی و یونانی کی جگہ لی تھی۔ اسی لیے میکالے نے اپنی مشہور رپورٹ میں یہ عزم ظاہر کیا تھا کہ انگریزی کا ہندستان کے لیے وہی کردار ہوگا جو لاطینی و یونانی کا مغربی یورپ کے لیے تھا۔ اس کا ٹھیک مطلب تو یہ تھا کہ جس طرح انگریزی نے لاطینی و یونانی کے متنی سرمائے سے قوت کشید کی تھی، اسی طرح ہندستانی دیسی زبانیں انگریزی سے طاقت حاصل کریں گی اور بالآخر ہندستان میں جدیدیت اورجدیدکاری کا وسیلہ بنیں گی، مگر یہ 'مطلب' بھی 'پرسوا' ہی تھا، اصل مقصد انگریزی کا تسلط تھا۔ اس 'پرسوا' کو ارنسٹ کراسبی نے، کپلنگ کی نظم کے جواب میں لکھی گئی "White The Real Man's Burden" میں تارتار کیا تھا جوفروری ۱۸۹۹ء میں نیویارک ٹائمز میں شایع ہوئی تھی۔

Take up the White Man's burden; / To you who thus succeed

In civilizing savage hoards/ They owe a debt, indeed;

Concessions, pensions, salaries, / And privilege and right,

With outstretched hands you raise to bless

Grab every thing in right(16)

انگریزی کو'مہذب بنانے اورجدیدیت برپا کرنے کی قوت' کےطور پر پیش کرنا ڈسکورس تھا:علمی اورثقافتی آدرش کے پردے میں طاقت و اجارے کا حصول تھا۔ چناں چہ۱۸۴۴ء میں برطانوی استعمار نے فیصلہ کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں صرف ان ہندستانیوں کوترجیح دی جائے گی جوانگریزی جانتے ہوں۔(۱۷) انگریزی زبان کےعلم کو ماتحت ملازمتوں سے جوڑنے کے ساتھ

ی سفید آدمی کے اس ثقافتی منصوبے سے نقاب ہٹ گیا جس کا مقصد ہندستان کو ''مہذب اور جدید'' بنانا ظاہر کیا گیا تھا۔ چناں چہ انگریزی نظامِ تعلیم کے ذریعے زیادہ تر وہ کلرک اور ماتحت ملازم ہی پیدا ہوئے جو بلندتر انسانی مقاصد سے نا آشنائے محض تھے۔ جلد ہی یہ بات عیاں ہوتی چلی گئی کہ انگریزی کو طاقت اور تحکم کی زبان کے طور پر نافذ کیا گیا تھا۔ انگریزی ''لسانی استعمار'' کا ذریعہ، مظہر اور استعارہ بنی۔

لسانی استعماریت کا سادہ مطلب کسی زبان کا ایسا غلبہ ہے جو دیگر زبانوں کی پسپائی اور استحصال کی شرط پر ہو۔ لسانی استعماریت میں ایک زبان سے وہ قوت وابستہ کر دی جاتی ہے جو دوسری زبانوں کو طاقت اور انھیں سماجی عرصے میں حاصل مقام سے محروم کرتی چلی جاتی ہے۔ زبان کی قوت بہ قول رابرٹ فلپسن کے، ساختی اور ثقافتی ہے۔ ساختی، مادی خصوصیات (جیسے ادارے، معاشی مفادات) اور ثقافتی، غیر مادی یا آئیڈیالوجیکل خصوصیات رکھتی ہے۔(۱۸) لہٰذا انگریزی کی استعماریت کو قائم کرنے کے لیے اسے ریاستی و تعلیمی امور کی زبان بنایا گیا، سرکاری عہدوں کے لیے لازم کیا گیا اور معاشی مفادات کے حصول کا اہم ذریعہ بنایا گیا، اور اس سے عزت، وقار، برتری، اسٹیٹس کو جوڑ دیا گیا۔

یہ واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں یہ صلاحیت خلقی طور پر موجود ہوتی ہے کہ وہ ساختی قوت حاصل کر سکے۔ ثقافتی قوت تو زبان میں پہلے سے موجود ہوتی ہے اور اس کا اظہار اپنے متعلقہ سماجی گروہ کو منفرد شناخت دینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر زبان، سرکار دربار کی زبان اور عزت، وقار کی علامت بننے کی اہلیت، خود زبان اپنی تشکیل کے عمل ہی میں حاصل کر لیتی ہے۔ لسانی استعماریت قائم کرتے ہوئے زبانوں کی اس صلاحیت کا نہ صرف شعور موجود ہوتا ہے، بلکہ اس شعور سے ایک قسم کا خوف بھی وابستہ ہوتا ہے۔ اس خوف کی کم و بیش وہی کیفیت ہوتی ہے جس کا تجربہ کسی بھی آمر کو لوگوں کی ممکنہ بغاوت کے سلسلے میں عام طور پر ہوتا ہے۔ چناں چہ لسانی استعماریت میں یہ کوشش مسلسل کی جاتی ہے کہ دوسری زبانیں معاشی اور

آئیڈیالوجیکل قوت حاصل نہ کرسکیں۔ وہ تمام راستے مسدود کرنے کی کوششیں ہر سطح پر کی جاتی ہیں، جو دوسری زبانوں کی ترقی وفروغ کے ہوتے ہیں۔ اس طور لسانی استعماریت زبانوں کے مابین غیر مساویانہ رشتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

لسانی استعمار کے سلسلے میں پہلی کوشش، استعماری زبان اور دوسری زبانوں میں عدم مساوات کو ابھارنا اور باور کرانا ہوتا ہے۔ لارڈ میکالے کا یہ ارشاد کہ ''یورپ کی کسی اچھی لائبریری کی الماری میں ایک تختے پر رکھی ہوئی کتابیں، ہندوستان اور عرب کے مجموعی سرمایہ علمی پر بھاری ہیں۔'' یا یہ دعوا کہ ''مجھے کوئی بھی ایسا مستشرق نہیں ملا جس نے یہ دعوا کرنے کی جسارت کی ہو کہ عربی اور سنسکرت کے شعری سرمائے کا عظیم یورپین اقوام کی تخلیقاتِ شعری سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔(۱۹) اصلاً انگریزی اور ہندستانی کلاسیکی زبانوں میں عدم مساوات کو خالصتاً آئیڈیالوجیکل بنیادوں پر ابھارنے کے سلسلے میں تھا۔ میکالے کے خیالات ایک حد تک، ان مستشرقین کی مخالفت میں ظاہر ہوئے تھے جو ہندستانیوں کو ان کی کلاسیکی زبانوں کی تعلیم دینے کے حق میں تھے کہ اس حکمت عملی سے ہندستانیوں کے دل جیتے جا سکتے تھے اور میکالے ہندستانیوں کے دل جیتنے کے بجائے ان کے ذہن بدلنے کے حق میں تھا: ایسا ہندستانی طبقہ وجود میں لانا چاہتا تھا جو دیکھنے میں ہندستانی مگر ذوق و ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو۔ دیکھا جائے تو میکالے زبان کی ساختی اور ثقافتی طاقت کا علم اور اس طاقت کو بروے کار لانے کی حکمت عملی کا شعور، مستشرقین کے مقابلے میں زیادہ رکھتا تھا۔ ہندستانیوں کے دل جیتنا اور دماغ بدلنا، دونوں کے سیاسی مقاصد تھے، مگر مستشرقین کی حکمت عملی میں مقامی ثقافت کے لیے کسی نہ کسی درجے میں ہم دردی موجود تھی اور میکالے سمیت دوسرے انگریزی پسندوں کی تدبیر میں جارحیت تھی۔ مستشرقین ہندستانیوں کو ہندستانی مذہبی وثقافتی طریقوں کے تحت تابع رکھنے کے حامی تھے۔ اسی لیے وارن ہیسٹنگز نے مسلمانوں کے لیے کلکتہ مدرسہ اور لارڈ منٹو نے ہندوؤں کے لیے بنارس کالج قائم کیا۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے زبان کی محض ثقافتی قوت کا ادراک کیا تھا اور اس قوت کو ملیا میٹ کرنے کے بجائے

اسے سیاسی و استعماری مقاصد کے لیے ابھارا تھا، جب کہ انگریزی پسندوں کے نزدیک انگریزی زبان کی ساختی قوّت کو ابھارنا اہم تھا اور ان کا موقف تھا کہ ہندستانی ثقافتی طریقوں کے بجائے انگریزی طریقوں سے ہندستانیوں کو تابع رکھنے کا عمل زیادہ مفید تھا۔ چناں چہ میکالے سے پہلے چارلس ٹریویلین نے یہ موقف پیش کیا تھا کہ ''انگریزی ادب بلاشبہ مقامی سوچ پر استعماری گرفت کے نہایت موثر ذرائع میں سے ایک ہے۔''(۲۰)

انگریزی کے استعماری غلبے سے ہندستان کی کلاسیکی اور دیسی زبانوں میں عدم مساوات پوری طرح قائم ہوگئی۔ ایک نیا طبقہ بھی وجود میں آ گیا جو ذوق وذہن کے لحاظ سے انگریز تھا۔ حقیقت میں یہ طبقہ انگریزی کا 'پرسوا' تھا، خالصتاً انگریزی استعماری مقاصد کے لیے انگریز ہونے کی اداکاری کرتا تھا اور اس مشقت کے صلے میں انگریزی حکومت کے سیاسی، معاشی حاصلات میں اُس ادنی سطح پر شریک تھا، جو انگریز آقاؤں کے دل میں تمام ہندستانیوں کے لیے تھی، مگر سوال یہ ہے کہ کیا انگریزی استعماریت نے زبان کی جس ساختی وثقافتی قوت کا ادراک کیا تھا، اس کی مدد سے وہ 'مقامی سوچ' پر ناقابل شکست استعماری گرفت رکھنے میں کام یاب ہوئی؟

اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ لسانی استعماریت، مقامی زبانوں سے مادی اور آئیڈیالوجیکل سطح پر جو فاصلہ اختیار کرتی ہے، اس کے نتیجے میں مقامی زبانوں میں احساسِ محرومی اور احساسِ شکست پیدا ہوتا اور پھر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لسانی استعماریت کی توقعات کے عین برعکس یہ احساسِ شکست ومحرومی مقامی زبانوں سے وابستگی اور ان کے ذریعے اپنی ثقافتی شناخت استوار کرنے کے جذبے کو بڑھاوا دیتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ لسانی استعماریت سے پہلے مقامی لوگوں میں زبان کے حوالے سے اپنی ثقافتی اور قومی شناخت پر اصرار موجود نہیں ہوتا۔ یہی 'لسانی ثقافتی قومی شناخت' کو محرومی وپسپائی کا دل خراش احساس لیے ہوتی ہے، لسانی استعماریت کو اس بساط پر فیصلہ کن کردار ادا کرنے سے باز رکھتی ہے جو مقامی سوچ کو مفلوج ومعطل کرنے کی غرض سے بچھائی جاتی ہے۔ کثیر لسانی معاشروں میں جب ''لسانی قومی شناخت'' پر اصرار بڑھ جاتا

ہے تو علاحدگی پسندی اور آزادی کی تحریکیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان کا ہدف خود لسانی استعماریت اور اس کے مظاہر بھی بنتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ لسانی استعماریت زبان کی ثقافتی قوت کو بھی ابھارتی ہے اور اس کا ذریعہ 'یورپی سائنسوں اور یورپی ادبیات' کی تدریس ہوتا ہے۔ ہر چند اس سے یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ حقیقی علم اور بڑا ادب صرف انگریزی یا فرانسیسی میں ہے اور ان کے مقابلے میں تمام ایشیائی و افریقی زبانیں پس ماندہ و درماندہ ہیں۔ ''اس زبان (انگریزی) نے فطرتِ انسانی اور حیاتِ انسانی کی متوازن اور شگفتہ ترجمانی کی ہے۔ اس زبان میں ہر تجرباتی علم کے بارے میں ایسی مکمل اور صحیح معلومات فراہم ہیں جن کی مدد سے صحتِ عامہ کا تحفظ ہوسکتا ہے ... اور فراستِ انسانی کو نئی نئی وسعتیں مل سکتی ہیں۔ انگریزی زبان سے جسے بھی واقفیت ہے، اسے اس وسیع فکری اثاثے تک ہمہ وقت رسائی حاصل ہے جسے روے زمین کی دانش ور ترین قوموں نے باہم مل جل کر تخلیق کیا ہے۔''(۲۱) زبان کا یہ حد درجہ پر شکوہ، تفاخر آمیز اور بڑی حد تک نرگسیت پسندانہ تصور لسانی استعماریت کی بنیاد میں پتھر کا کام دیتا ہے اور نوآبادیاتی باشندے استعماری زبان کے اس تصور سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتے، اور بعض اوقات تو وہ استعماری زبان اور حقیقی علم اور بڑے ادب کو ایک سمجھنے کے منطقی مغالطے کا شکار بھی ہوجاتے ہیں۔ اس بات کو صدقِ دل سے اور پوری ذہنی دیانت داری سے ماننے لگتے ہیں کہ اگر حقیقی علم حاصل کرنا اور ترقی کرنا ہے تو صرف انگریزی پڑھنا ہوگی، اپنی زبانوں کو دریا برد کرنا ہوگا۔ ایک اور زاویے سے یہ مغالطہ انگریزی کی برتری کے ساتھ ہی اپنی زبان کی لازمی کہتری کے اس تصور کو پیدا کرتا ہے، جس کے وسیع ثقافتی مضمرات ہوتے ہیں۔ سرسید کی اس رائے میں یہی مغالطہ پوری شدت سے موجود ہے۔

> اگر ہم اپنی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کر دیں، ہماری زبان یورپ کی اعلا زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہوجائے، یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم

> دن رات ہمارے دست مال ہوں، ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں، ہم اپنی قدر، اپنی عزت کی قدر خود آپ کرنی سیکھیں، ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اس کو اپنی محسن ومربی سمجھیں۔(۲۲)

لسانی استعماریت جب زبان کی ثقافتی قوت کو ابھارتی اور ریاستی و تعلیمی اداروں کے ذریعے اس کے عام بہاؤ کا اہتمام کرتی ہے تو گویا خودشکنی کا انتظام بھی کرتی ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہ حقیقت نہیں ہوتی یا وہ اس حقیقت پر قابو پانے سے قاصر ہوتی ہے کہ زبان کی ثقافتی طاقت پر ناقابلِ شکست اجارہ محال ہے۔ علوم و ادبیات کے جس ذخیرے میں زبان کی ثقافتی طاقت مضمر ہوتی ہے، وہ ایک ایسے متن کی طرح ہوتا ہے جس کے اطراف کھلے (open-ended) ہوتے ہیں۔ یہ متن اپنے بنانے والے یا اس پر اجارے کا دعوا اور کوشش کرنے والوں کے منشا کے برعکس، اپنے پڑھنے والوں سے معاملہ کرنے میں آزاد ہوتا ہے اور متعدد ایسے نتائج پیدا کرتا ہے، جن کی لسانی استعماریت میں پیش بندی نہیں کی جا سکتی۔

کوئی زبان بجائے خود استعماری نہیں ہوتی اور نہ اس میں موجود علوم و ادبیات کے رگ وریشے میں استعماری منشا سرایت کیے ہوتا ہے۔ استعماریت زبان کی جوہری خصوصیت نہیں، اس کا مخصوص سیاسی استعمال ہے۔

قصہ مختصر لسانی استعماریت بالآخر ایک کثیر سمتی صورتِ حال کو جنم دیتی ہے۔ نوآبادیاتی ممالک سیاسی آزادی حاصل کرنے کے باوجود اس صورتِ حال اور اس کے مضمرات سے پوری طرح نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ صورتِ حال اس مفہوم میں کثیر سمتی ہوتی ہے کہ یہ کئی طرح کے لسانی اور ثقافتی رویوں کی محرک ہوتی ہے۔ یہ رویے اکثر باہم متضاد ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ایک سے زیادہ ثقافتی شناختوں کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً لسانی استعماریت میں مقتدر طبقے کی زبان کو جو ساختی و ثقافتی برتری دی جاتی ہے، وہ مقامی لوگوں کی ایک جماعت کو ''غیر مقامی

وغیر ارضی شناخت'' قائم کرنے کی تحریک دیتی ہے۔ یہ جماعت مقامی زبان کو محدود و پس ماندہ قرار دیتی اور اس سے اوپر اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ کوشش ایک آفاقی شناخت پر اصرار سے عبارت ہوتی ہے۔ مقتدر طبقے کی زبان آفاقی تسلیم کر لی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ استعمار کا اپنی زبان کو آفاقی قرار دینا اور محکوم افراد کا اسے آفاقی تسلیم کر لینا دو الگ الگ معاملے ہیں۔ استعمار عام طور پر اپنی زبان کو تاریخی و اقتداری مفہوم میں آفاقی ٹھہراتا ہے: اس کی زبان اس کی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی نوآبادیوں میں رائج ہونے کی تاریخ رکھتی اور نوآبادیوں کی زبانوں پہ اقتداری برتری کی حامل ہوتی ہے، مگر جب مقامی افراد انگریزی ،فرانسیسی یا ہسپانوی کو آفاقی زبان تسلیم کرتے ہیں تو یہ ایک خالص تنقیدی فیصلہ نہیں ہوتا؛ یہ اس لسانی حکمت عملی کا لازمی سماجی نتیجہ ہوتا ہے کہ جو ایک زبان کو دوسری زبانوں کی قیمت پہ اقتداری حیثیت دینے سے عبارت ہوتی ہے۔ بہ ہرکیف مذکورہ جماعت جس ثقافتی شناخت کا دعوا کرتی ہے، وہ اصلاً ایک عقلی نقطۂ نظر ہے؛ وہ تجربے اور واردات سے تہی ہے؛ دلیل، منطق سے عبارت ہے۔ اس میں عصبیت نام کو نہیں ہوتی، ایک سرد قسم کی غیر جانب داری اور گرم جوشی اور حدت سے محروم رواداری ہوتی ہے۔ تاہم اس میں غیر معمولی لچک ہوتی ہے۔ اسے اپنی کسی ایک تعبیر پر اصرار نہیں ہوتا۔ یہ شناخت عقلی طور پر تسلیم کرتی ہے کہ زمین اس کی بنیاد ہے، مگر کسی ایک خطۂ زمین سے اس کی جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔

آفاقی ثقافتی شناخت کے حامل گروہ کے بالکل برعکس ارضی ثقافتی شناخت کی حامل ایک جماعت پیدا ہوتی ہے۔ سب سے اہم اور دل چسپ بات یہ ہے کہ لسانی استعماریت سے پہلے یہ جماعت فعال طور پر موجود نہیں ہوتی، بالقوہ ضرور موجود ہوتی ہے۔ دراصل لسانی استعماریت ہی لسانی شناختوں کا تصوّر عام کرتی اور انھیں ایک دوسرے کے مقابل لاتی ہے۔ ارضی ثقافتی شناخت پر اصرار کا مطلب اپنی زبان اور ثقافت کا احیا ہے۔ اس میں ماضی کا رومانوی اور غیر تنقیدی تصوّر ہوتا ہے جو معاصر عہد کی حقیقتوں سے لاتعلق ہوتا ہے۔ یہی اس شناخت کی خصوصیت ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے و حواشی

(۱) برنارڈ ایس کوہن، (۱۹۹۶ء (۱۹۴۸ء) Colonialism and its Forms of Knowledge، نیوجرسی، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ص۴

(۲) ایضاً ، ص ۱۷

(۳) جان گل کرسٹ (John B. Gilchrist)، ۱۷۹۰ء، دیباچہ A Dictionary of English and Hindostance، کلکتہ، ص ۷

(۴) بہ حوالہ رے منڈ شواب، ۱۹۸۴ء، The Oriental Renaissance، نیو یارک، کولمبیا یونیورسٹی، ص۱۶۲

(۵) گریرسن، Linguistic Survey of India، جلد اوّل، لاہور، اکیوریٹ پرنٹرز، ص ۲۱-۲۲

(۶) کوہن، ۱۹۹۶ء (۱۹۴۸ء)، Colonialism and Its Forms of Knowledge، ص۲۱

(۷) Linguistic Survey of India، جلد اول، ص۲

(۸) گل کرسٹ، ۱۸۰۰ء، The Anti-Jargonist، کلکتہ، ص ۴۷

(۹) Colonialism and Its Forms of Knowledge، ص ۱۸

(۱۰) وینا نزیگل، ۲۰۰۱ء، Language Politics, Elites, and the Public Sphere، نئی دہلی، پرمانٹ بلیک، ص۴۳

(۱۱) بہ حوالہ رابرٹ فلپس، ۱۹۹۲ء - Linguistic Imperialism، دہلی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ص ۴۵

(۱۲) http://www.boondocksnet.com/ai/(Jan.11-04)

(۱۳) ایضاً

(۱۴) رابرٹ فلپسن، Linguistic Imperialism,، ص۱۱۱

(۱۵) رابرٹ فلپسن، Linguistic Imperialism، ص ۴۷

(۱۶) ٹی۔بی میکالے، مقالہ میکالے (ترجمہ سید شبیر بخاری) مشمولہ، میکالے اور برصغیر کا نظامِ تعلیم،

لاہور، آئینہ ادب، ص ۳۱

(۱۷) بہ حوالہ ڈاکٹر طارق رحمان، ۱۹۹۶ء، پاکستان میں اردو انگریزی تنازع، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ص ۲۳

(۱۸) ٹی۔بی میکالے، مقالہ میکالے، ص ۳۲

(۱۹) سرسید احمد خاں، ۱۹۶۳ء، مقالات سرسید (جلد ۱۵)، (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۷۷

(۲۰) کے۔ کے عزیز، ۲۰۰۷ء، (۱۹۷۶ء)، The British Imperialism، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۲۳۳

(۲۱) عزیز احمد، ۲۰۰۶ء (طبع سوم) برصغیر میں اسلامی جدیدیت (ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی)، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ص ۲۵

(۲۲) کے کے۔عزیز، The British Imperialism، ص۔ ۲۳